علمِ قراءت عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں

ظفر الاسلام اصلاحی

قرآن کریم انسان کے لیے ہدایت کا سب سے بڑا ذریعہ، ابدی حقائق کا لازوال خزانہ اور علوم و معارف کا لامتناہی گنجینہ ہے۔ اس میں غور و فکر کرنا اور اس کے معنی و مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہدایت کی راہیں کھولتا ہے اور اسے پڑھنا و تلاوت کرنا خیر و برکت کا ذریعہ بنتا ہے۔ جس طرح اس میں تدبر و تفکر اور اس کے مطالب کو سمجھنے کے کچھ اصول و آداب ہیں اسی طرح اس کی تلاوت و قرأت کا حق ادا کرنا بھی متعینہ اصول و ضوابط کی پابندی پر منحصر ہے۔ انہی اصول و ضوابط کے ساتھ قرآن مجید کی قرأت کا طریقہ جب فن کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو اسے علم قرأت یا تجوید سے موسوم کیا جاتا ہے۔ سیدھے سادے الفاظ میں اس علم کی تعریف کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ صحتِ مخارج اور درستگیٔ تلفظ کے ساتھ قرآن کریم کو بایں طور پر پڑھا جائے کہ اس کے الفاظ کا ظاہری حسن نہ صرف برقرار رہے بلکہ اچھی طرح واضح ہو جائے۔ اسی لیے اس علم کو تلاوت کا زیور اور قرآن کی زینت سے تعبیر کیا گیا ہے۔[1] اس کی اہمیت اور فضیلت کے ثبوت کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی کافی ہے کہ جو شخص قرآن کریم کو اس کے زمانہ نزول کی تر و تازہ کیفیت کے ساتھ پڑھنا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ وہ ابن ام عبد یعنی عبد اللہ بن مسعود کی قرأت اختیار کرے جنھیں تجوید قرآن اور اس کی تحقیق و ترتیل کا خصوصی ملکہ عطا ہوا تھا۔[2]

٭ یہ مقالہ نظامت سنی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام منعقدہ (بہ تاریخ ۱۷-۱۸ مارچ ۱۹۹۰ء) کل ہند قرأت کانفرنس میں پیش کیا گیا تھا، ترمیم و اضافہ کے بعد اسے یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔

یہ بھی قرآن کریم کے اہم فیوض و برکات میں شامل ہے کہ خود اس سے متعلق متعدد علوم کو وجود و فروغ ملا اور یہ بالواسطہ بہت سے علوم و فنون کی توسیع و ترقی کا باعث بنا۔ فنِ تجوید یا علم قرأت کو اول الذکر نوعیت کے علوم میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہ علم اس لحاظ سے بھی ممتاز ہے کہ عہدِ نبوی[۱] میں ہی اس کی داغ بیل پڑی اور بعد کے دَور میں اس کی آبیاری میں بھرپور دلچسپی لی گئی اور اس کی ترویج و ترقی کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ اس کے لیے تدریس و تعلیم اور تصنیف و تالیف کے مختلف ذرائع اختیار کیے گئے۔ اس موضوع پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ کب سے شروع ہوا اس بارے میں مورخین و تذکرہ نگاروں کی مختلف رائیں ملتی ہیں۔ مزید براں قرأتوں کے اختلاف کا مسئلہ اور فنِ قرأت میں امتیاز نہ کرنے کی وجہ سے قرأت کی اولین کتاب کا معاملہ اور زیادہ مختلف فیہ ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر ابو عبید قاسم بن سلام نے مختلف قرأتوں کو جمع کر کے ایک کتاب مرتب کی اسی کی بنیاد پر بعض مورخین و تذکرہ نگاروں نے علم قرأت کے موضوع پر انہیں پہلا مصنف قرار دیا جبکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب علم قرارت یا فن تجوید کے بجائے اختلاف قرأت سے تعلق رکھتی ہے۔ بہرحال مورخین و تذکرہ نگاروں کے اختلاف رائے کے نتیجہ میں علم قرارت کے موضوع پر اولین قلم کاروں کے جو نام سامنے آتے وہ یہ ہیں: امام کسائی[۳] (متوفی ۱۸۵ھ)، یحییٰ بن یعمر[۴] (م ۱۸۹ھ)، ابان بن تغلب[۵] (م ۱۴۱ھ)، مقاتل بن سلیمان[۶] (م ۱۵۰ھ)، ابوعمرو بن العلاء[۷] (م ۱۵۵ھ)، ہارون بن موسیٰ[۸] (م ۱۷۰ھ)، ابوعبید قاسم بن سلام[۹] (م ۲۲۴ھ)، ابوعمر حفص بن عمر دوری[۱۰] (م ۲۴۶ھ) اور موسیٰ بن عبید اللہ الخاقانی[۱۱] (م ۳۲۵ھ)۔ ان مختلف اقوال سے بہرحال مشترکہ طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس میدان میں تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں کا سلسلہ پہلی صدی ہجری کے آخر سے شروع ہوا۔ علم قرأت پر اولین کتاب کی بابت اختلاف رائے کے باوجود اس پر تقریباً سب کا اتفاق ہے کہ متقدمین میں اس فن کے امام ابوالقاسم الشاطبی[۱۲] (متوفی ۱۱۹۴ء) اور محمد بن محمد الجزری[۱۳] (متوفی ۱۴۲۹ء) گذرے ہیں۔ انھوں نے عملی طور پر اس علم کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ اپنی تصنیفی و تالیفی صلاحیتوں کو بھی اس کی تشریح و توضیح اور ترویج میں استعمال کیا۔ اس میدان میں نمایاں تصنیفی کارنامے انجام دینے والوں میں پانچویں صدی ہجری کے مشہور عالم و مفسر قرآن مکی بن ابی طالب (متوفی ۴۳۷ھ/۱۰۴۵ء) ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ اس موضوع

پر ان کی متعدد تصانیف ملتی ہیں جن میں سب سے اہم "معانی القراءات" اور "الرعایۃ لتجوید القراءۃ" کے نام سے جانی جاتی ہیں[۱۴]۔

عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان یا مسلم حکومت کا زمانہ سیاسی حیثیت سے اہمیت رکھنے کے علاوہ مختلف علوم وفنون کی ترقی کے لیے بھی معروف ہے۔ علم دوستی و معارف پروری کی جو روشن روایت مسلم حکمرانوں نے تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں قائم کی تھی اسے عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلم سلاطین وملوک نے نہ صرف باقی رکھا بلکہ اسے اس قدر ترقی دیا کہ اس وقت کا ہندوستان بالخصوص دارالسلطنت دہلی پوری اسلامی دنیا کے اہل علم وفن کے لیے مرجع و ماویٰ بن گیا اور مختلف علوم وفنون کی ترویج واشاعت کا مرکز قرار پایا۔ معاصر مورخین واضح الفاظ میں اس کی شہادت پیش کرتے ہیں[۱۵]۔ ان علوم وفنون میں یقینی طور پر قرآنی علوم بھی شامل تھے جیسا کہ اس موضوع پر خاکسار کے تفصیلی مطالعہ سے بخوبی واضح ہوتا ہے[۱۶]۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ علوم قرآنیہ میں علم قرأت کو ایک کلیدی واساسی حیثیت حاصل ہے۔ اور عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں اس علم کی ترویج وترقی میں مختلف نوع کی قابل ذکر خدمات انجام دی گئیں جیسا کہ ذیل کی تفصیلات سے واضح ہوگا۔

ناظرہ قرآن اسلامی نظام تعلیم کا لازمی جز ہے اور اس کا اہتمام ہر دور میں کیا جاتا رہا ہے۔ اس ضمن میں ہندوستان میں مسلم حکومت کا زمانہ کوئی استثنائی حیثیت نہیں رکھتا لیکن یہ وضاحت اہمیت سے خالی نہیں کہ اس وقت صحت مخارج کے ساتھ قرآن پڑھانے پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ مکاتب و مدارس اور انفرادی مراکز میں قرآن پڑھانے کے لیے جو اساتذہ مامور ہوتے تھے وہ قرارت یا فن تجوید کے ماہر ہوتے تھے اور ان کے لیے "مقری" کی خاص اصطلاح رائج تھی[۱۷]۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس دور میں اچھا قرآن پڑھنے والے کے لیے ایک دوسری اصطلاح "قرآن خواں" بھی مستعمل تھی۔ اس زمانہ میں علمِ قرارت میں عمومی دلچسپی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اچھی آواز سے قرآن پڑھنے میں مہارت کی وجہ سے بعض سلاطین وامرا بھی "قرآن خواں" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ معاصر تاریخوں میں یہی لقب سلطان قطب الدین ایبک (۱۲۰۶-۱۲۱۰ء)

کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔[18] مزید براں عہد فیروز شاہی (۱۳۵۱-۱۳۸۸ء) کے ایک ممتاز امیر اور اہم عہدہ دار (سامانہ و بدایوں کے گورنر) ملک قبول بھی اسی لقب سے ملقب کیے گئے ہیں۔[19] اسی نسبت سے ان کی ایما سے ترتیب دیا گیا فتاوی کا مجموعہ "فتاوائے قرآن خوانی" کے نام سے معروف ہوا۔[20] گرچہ بعض ذخائرِ کتب کے فہرست نگار اور جدید اسکالرس غلط طور پر اسے "فتاوائے قراخانی" کے نام سے ذکر کرتے ہیں۔[21] اچھی آواز یا حسنِ قرات کے ساتھ قرآن پڑھنے والے کے لیے مقری و قرآن خواں کے علاوہ ایک تیسرا لفظ "خوش خواں" بھی مستعمل تھا جیسا کہ امیر حسن سجزی نے شیخ نظام الدین اولیاء کے ایک عزیز اور ماہر قرات مولانا قاسم کے لیے استعمال کیا ہے۔[22]

معاصر تاریخی کتب اور تذکروں میں "مقری" کے حوالے بکثرت ملتے ہیں۔ اس سے جہاں ایک جانب یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فنِ قرات میں مہارت رکھنے والے اس وقت کثیر تعداد میں پائے جاتے تھے۔ دوسری جانب اس سے یہ ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے کہ اس فن کے سیکھنے و سکھانے میں کافی دلچسپی لی جاتی تھی اور اس کی تعلیم کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ حکومت کی جانب سے اس کا اہتمام اس امر سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جہاں مکاتب و مدارس میں اساتذہ کی تقرری اور حکومت کے خزانہ سے ان کو مشاہرہ دیئے جانے کا ذکر ملتا ہے وہاں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ ان اداروں میں ایسے استاد مقرر کیے جاتے تھے جو بچوں کو قرات و کتابت سکھاتے تھے۔[23] اسی طرح سلاطینِ دہلی ہمت افزائی کے طور پر اہلِ علم و فن پر جو انعام و اکرام کرتے تھے اس سے متعلق بعض مآخذ میں صاف طور پر اہلِ قرات کا حوالہ ملتا ہے۔ سلطان قطب الدین ایبک کے تذکرہ میں تاریخ فخر الدین مبارک شاہ کے الفاظ یہ ہیں "ادرارا تے و مشاہرا تے کہ مستحقان از اہل علم و فقہ و قرات و زہد و مصلحان داشتند آں ہم برحال داشتن فرمود"۔[24] سلطان غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶-۱۲۸۶ء) نے شہزادہ بغرا خاں کو جہاں بہت ساری نصیحتیں کی تھیں وہیں اس نے یہ بھی اس کے گوش گذار کیا تھا کہ وہ اپنی حکومت کے مرکز کو علماء و مشائخ، علم تفسیر و حدیث کے ماہرین، حفاظ قرآن، مقریان اور واعظین و خطباء سے آباد رکھیں گے۔[25]

یہاں ایک اہم سوال یہ ابھرتا ہے کہ عہد زیر بحث میں ماہرین قرارت کی کثرت اس فن کے استادوں کی بہتات اور اس کے سیکھنے سکھانے کے رواج کے باوجود اس عہد کے نصاب تعلیم میں اس مضمون کا ذکر شاذ و نادر ہی ملتا ہے حتیٰ کہ عہد جدید کے بعض علماء و دانشوروں نے اس زمانہ کے نصاب تعلیم اور اس کے عہد بہ عہد ارتقار پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کی پیش کردہ تفصیلات بھی اس مضمون کے ذکر سے خالی ہیں[۲۶]۔ اس کی مختلف توجیہات پیش کی جاسکتی ہیں۔ اول یہ کہ نصاب تعلیم کی تفصیلات بالعموم مدارس کی سطح کی تعلیم یا اعلیٰ درجات سے متعلق ملتی ہیں اور یہ فن مکاتب یا تعلیم کے ابتدائی مرحلہ میں سکھایا جاتا تھا یا مساجد میں حفظ کے ساتھ اس کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس زمانہ میں مکاتب و مدارس کی بہ نسبت تعلیم کے انفرادی مراکز زیادہ مقبول تھے۔ استادانِ فن اور ماہرینِ علم اپنے اپنے مقام پر درس و تدریس کی مجلسیں منعقد کرتے تھے اور تشنگانِ علم اپنی دلچسپی اور اس وقت کے تقاضے کے مطابق متعلقہ فن کے استاد سے فیضیاب ہوتے تھے اور یہ بات بدیہی ہے کہ اس غیر رسمی لیکن اہم نظام تعلیم کا کوئی باضابطہ یا مقررہ نصاب نہیں ہوتا تھا۔ اسی لیے اس زمانہ کے علماء و فضلار کے تذکروں میں اس صراحت پر خاص زور دیا جاتا ہے کہ فلاں عالم نے فلاں استاد سے فلاں مضمون یا فن کی تعلیم حاصل کی اور یہ وضاحت کم ملتی ہے کہ فلاں نے فلاں مدرسہ سے فراغت حاصل کی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس زمانہ کے کسی بھی مدرسہ کی درسیات کے ضمن میں علم قرأت کا ذکر نہیں ملتا۔ کم از کم عہد فیروز شاہی کے سب سے بڑے تعلیمی مرکز "مدرسہ فیروز شاہی[۲۷]" میں پڑھائے جانے والے مضامین میں قرأت کا ذکر صاف طور پر ملتا ہے[۲۸]۔ یہاں یہ ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا کہ اس مدرسہ کے مہتمم یا پرنسپل مولانا جلال الدین رومی کے بارے میں یہ واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے، کہ وہ دیگر علوم و فنون کے ساتھ ساتھ قرارت سبعہ سے بھی بخوبی واقف تھے[۲۹]:

راوی ہفت قرارت سند چاردہ علم   شارح پنج سنن مفتی مذہب ہر چہار

ان تفصیلات سے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس علم کی ترویج و اشاعت میں ماہرین قرارت کی انفرادی کوششوں کے علاوہ اس عہد کے تعلیمی اداروں میں بھی اس کی تعلیم کا اہتمام جاری رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ دیگر علوم کے ماہرین کے مثل علم قرارت میں عبور

رکھنے والے بھی قلمرو سلطنت کے مختلف حصوں میں پائے جاتے تھے۔ اس کی ایک جھلک اس سے ملتی ہے کہ مسلم حکومت کے قیام کے بالکل ابتدائی زمانہ میں ہی صرف عام قاری نہیں بلکہ قرارات سبعہ کے ماہرین بعض غیر معروف مقامات پر بھی دستیاب تھے۔ جیسا کہ شیخ بہار الدین زکریا ملتانی (م ۱۲۶۲ء) کے تذکرہ میں ملتا ہے کہ انھوں نے کوٹ ارور جیسی چھوٹی جگہ میں سات طرز سے قرارت سیکھی تھی۔[۳۰] مشہور چشتی بزرگ شیخ حمید الدین ناگوری (م ۱۲۷۶ء) ناگور کے ایک گاؤں سوال میں سکونت پذیر تھے وہاں کی مسجد میں حفظ قرآن کا خاص اہتمام تھا اور فن قرارت پر بھی خاص زور دیا جاتا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو جمعہ کے دن خاص طور پر وہاں بھیجتے تھے تاکہ وہاں کچھ وقت گذاریں اور حفاظ کے طرز قرارت سے روشناس ہوسکیں اور یہ دیکھیں کہ:

حافظاں چگونہ قرآں می خوانند مدو تشدید چگونہ نگاہ می دارند[۳۱]

اس سے بھی اہم یہ کہ شیخ نظام الدین اولیاء نے بدایوں میں جس شخص سے قرآن شریف پڑھا تھا وہ شادی مقری نام کے نومسلم غلام تھے اور قرارات سبعہ سے واقف تھے۔ انھوں نے یہ فن خود اپنے آقا سے سیکھا تھا جو لاہور کے رہنے والے تھے اور خواجگی مقری کے نام سے معروف تھے۔[۳۲]

یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ صوفی لٹریچر میں قرارت سیکھنے سکھانے کے بکثرت حوالے ملتے ہیں۔ ان سے یہ صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ صوفیاء کے یہاں اس کی تعلیم و تمرین کا خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا۔ وہ اپنی خانقاہوں میں مختلف طریقے سے اس علم کو رواج دینے کی کوشش کرتے تھے۔ اس علم میں شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی اور شیخ حمید الدین ناگوری کی دلچسپی کی جانب اشارہ کیا جاچکا ہے۔ شیخ فرید الدین گنج شکر کے بارے میں یہ شہادت ملتی ہے کہ وہ اپنے مریدوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے اور قرارت کے اصول وضوابط بھی سکھاتے تھے۔[۳۳] شیخ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات میں ترتیل اور اچھی آواز کے ساتھ قرآن پڑھنے پر خاص زور ملتا ہے۔[۳۳الف] شیخ کے بارے میں یہ مذکور ہوچکا ہے کہ انھوں نے اپنے بچپن میں اس فن کے ایک ماہر شادی مقری سے قرآن شریف

پڑھا تھا لیکن جب وہ شیخ فریدالدین گنج شکر کے حلقۂ ارادت سے منسلک ہوئے تو مرشد نے اسے کافی نہیں سمجھا اور انھوں نے خود انھیں صحیح تلفظ اور صحت مخارج کے ساتھ قرآن پڑھنا سکھایا اور مکمل چھ پارے فن تجوید کے ساتھ انھیں پڑھایا۔[۳۴]

مزید براں شیخ نظام الدین اولیاء کے بیان کے مطابق ان کے مرشد کی خانقاہ حافظوں سے بھری رہتی تھی[۳۵] اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی خانقاہ میں اس علم کی ترویج کا عمومی ماحول قائم تھا۔ اپنے مرشد کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے شیخ نظام الدین اولیاء نے بھی اپنی خانقاہ میں اس فن کی تعلیم کا اہتمام جاری رکھا۔ انھوں نے ان تمام بچوں کے لیے جو ان کی نگرانی میں حفظ قرآن کا انتظام کیا اور اس کے لیے ایک ماہر قرارت مولانا علاءالدین اندپتی کو مامور کیا۔[۳۶] بعض ماخذ میں یہ بھی مذکور ہے کہ سلطان المشائخ کی خانقاہ میں دستر خوان کی یہ روایت جاری ہوئی کہ کھانا شروع ہونے سے قبل کوئی قاری کچھ آیتیں تلاوت کرتا تھا اور حاضرین اس سے محظوظ ہوتے تھے۔ یہ خدمت انہیں لوگوں میں سے کوئی انجام دیتا تھا جو شیخ کے دامن تربیت سے وابستہ ہو کر قرارت میں مہارت حاصل کر لیتے تھے اور یہ مختصر قرارت "دعاء مائدہ" کے نام سے جانی جاتی تھی۔[۳۷] مزید یہ کہ ہندوستان میں علماء و مشائخ کے حلقوں میں وعظ و تقریر سے پہلے تلاوت قرآن پاک اور متلو آیت کو عنوان بنا کر تقریر شروع کرنے کی روایت اسی زمانہ سے جاری ہے۔ اس عمل سے قرآن کریم سے حصول برکت کے علاوہ علم قرارت کو بھی رواج ملتا تھا۔

عہد زیر بحث میں فن قرارت یا تجوید کے جو ماہرین پائے جاتے تھے اور جنھوں نے اس کی ترویج و ترقی کو خواہ انفرادی مراکز کے ذریعہ ہو یا مکاتب و مدارس کی وساطت سے اپنا مشغلہ بنایا ان میں سے چند کا خصوصی تذکرہ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ ان کے بارے میں مورخین و تذکرہ نگاروں کے خیالات و تاثرات سے واقفیت ہو سکے اور یہ اندازہ بھی لگایا جا سکے کہ اس وقت اس علم سے کس حد تک دلچسپی پائی جاتی تھی اور اس فن کے کیسے کیسے ماہرین اس زمانہ میں موجود تھے۔

ہندوستان میں مسلم حکومت کے پہلے حصہ میں جو عہد سلطنت کے نام سے جانا جاتا ہے۔

متعدد علماء "مقری" کے لقب سے معروف ہوئے۔ اس عہد کے اولین مقریوں میں مولانا قاسم کا نام ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ سلطان غیاث الدین بلبن کے ہم عصر شیخ نظام الدین ابوالمؤید کے دامنِ تربیت سے وابستہ تھے۔ یہ فن تجوید کی تعلیم دینے کے علاوہ اپنے مرشد کی مجلس میں آغازِ وعظ کے وقت حاضرین کو اپنی قرأت سے محظوظ کرتے تھے جیساکہ شیخ نظام الدین اولیاء نے اپنے بچپن کے واقعات میں شیخ نظام الدین ابوالمؤید کی تذکیری مجلس اور مولانا قاسم مقری کی قرأت کا خصوصی ذکر کیا ہے۔[۳۸] سلطان علاء الدین خلجی کا زمانہ (۱۲۹۶ - ۱۳۱۶ء) علمی و تمدنی ترقی کے لیے مشہور ہے۔ دیگر علوم کے ساتھ علم قرأت کے متعدد ماہرین اس عہد سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں کچھ ایسے تھے جو باقاعدہ مقری کے لقب سے معروف ہوئے مثلاً مولانا علاء الدین مقری، مولانا حمید مقری اور مولانا لطیف مقری، ان کے علاوہ جو حضرات اس فن میں ممتاز ہوئے ان میں مولانا جمال الدین شاطبی اور خواجہ زکی الدین دہلوی کے نام شامل ہیں۔ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ یہ عہد علائی کے ان ماہرین قرأت کا ذکر ہے جو دارالسلطنت دہلی کو زینت بخشے ہوئے تھے اور قرأت و دیگر علوم کے میدان میں دوسروں کو مستفید کرتے رہے۔ فنِ تجوید میں ان حضرات کے امتیاز و اختصاص کا اندازہ لگانے کے لیے معاصر مورخ ضیاء الدین برنی کا یہ بیان کافی ہے کہ "مثل ایشاں در خراساں و عراق نشان نداده اند"[۳۹] (خراسان و عراق میں بھی ان کے ہمسر نہیں پائے جاتے)۔ ان کے علاوہ عہد سلطنت میں اس علم کی اشاعت و ترقی میں حصہ لینے والوں میں خواجگی مقری، شادی مقری، شہاب الدین مقری اور علاء الدین اندپتی قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے اول الذکر دو مقریوں کا مختصر بیان پہلے گذر چکا ہے۔ علاء الدین مقری کے بارے میں بھی یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ وہ شیخ نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں بچوں کو حفظ کرانے و قرأت سکھانے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ شہاب الدین مقری تغلق سلاطین کے عہد حکومت سے تعلق رکھتے تھے اور شیخ نظام الدین اولیاء کے ارادت مندوں میں سے تھے اور فن تجوید میں اپنی مہارت کے لیے مشہور تھے۔ صاحب سیر الاولیاء کے بیان کے مطابق ان کی آواز "لحن داؤدی" کا اثر رکھتی تھی اور ان کی قرأت سن کر شیخ نظام الدین اولیاء پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ ان کی اسی خصوصیت کی وجہ سے سلطان المشائخ نے انہیں امامتِ نماز کی

خدمت سپرد کی تھی جو تا حیات جاری رہی[۴۰]۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے معاصر مولانا جلال الدین رومی اپنی دیگر خصوصیات کے ساتھ اس فن میں بھی یکتا تھے جیساکہ ان کے بارے میں یہ تصریح کی جا چکی ہے کہ وہ قراءات سبعہ میں درک رکھتے تھے۔

پندرہویں صدی عیسوی یا لودی خاندان کے زمانۂ حکومت (۱۴۵۱ـ۱۵۱۷) میں اس فن کے ماہر محمد بن محمود دہقری اور ان کے شاگرد راجح بن داؤد احمد آبادی (م ۱۴۹۸ء) گذرے ہیں[۴۱]۔ سولھویں صدی عیسوی کے نصف اول کے دو ماہرین قراءت سلیمان بن عفان مندوی (م ۱۵۳۷ء) اور عبدالملک غزنوی (م ۱۵۴۹ء) خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اول الذکر مغل بادشاہ ہمایوں (۱۵۳۰ـ ۱۵۳۹، ۱۵۵۴ـ ۱۵۵۶ء) کے ہم عصر تھے۔ ان سے فن قراءت میں استفادہ کرنے والوں میں چشتی صابری سلسلہ کے مشہور بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی (م ۱۵۳۸ء) شامل تھے۔ صاحب اخبار الاخیار شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے الفاظ میں "دی در فن تجوید قرآن یگانۂ عصر بود"[۴۲] (وہ فن تجوید میں یکتائے زمانہ تھے)۔ عبدالملک غزنوی کا اصل وطن غزنہ تھا جیساکہ نسبت سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ علم دوست سلطان سکندر لودی (۱۴۸۸ـ۱۵۱۷ء) کی درخواست پر وارد ہند ہوئے اور اسلام شاہ کے زمانہ (۱۵۴۵ـ۱۵۵۲ء) تک مختلف علوم و فنون کی اشاعت میں مصروف رہے۔ علم قراءت میں ان کی مہارت سے بھی بہت سے لوگ فیضیاب ہوئے[۴۳]۔ اسلام شاہ کے عہد ہی میں میر سید محمد مکی نے فن قراءت میں امتیاز حاصل کیا۔ قراءت کے سات مشہور طرز سے وہ بخوبی واقف تھے۔ ممتاز مورخ اور عالم عبدالقادر بدایونی نے ۱۵۵۱ء میں سنبھل میں انھیں سے قراءت سیکھی تھی[۴۴]۔ انہی کے قریب العصر سندھ کے ایک عالم قاضی قاضن بھکری (م ۱۵۵۱ء) مشہور قاری و عالم گذرے ہیں۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ کچھ عرصہ کے لیے انھوں نے بھکر کے قاضی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ بقول صاحب تذکرہ علماء ہند "سرآمد علماء وقت بالواع فضائل، حفظ قرآن و علم قراءت نیکو آراستہ بود"[۴۵]۔

عہدِ اکبری (۱۵۵۶ـ۱۶۰۵ء) میں اس میدان میں نمایاں مقام حاصل کرنے والوں میں شیخ بھیکن کاکوروی (م ۱۵۷۳ء)، سیف الدین کاکوروی، شیخ حمزہ لکھنوی اور عبدالقادر مندوی (م ۱۵۷۷ء) شامل ہیں۔ اول الذکر قراءت کے سات مشہور طریقوں سے حافظ تھے اور فنِ قراءت

کی ایک اہم کتاب "شاطبیہ" کا درس ان کے روزمرہ کے معمول میں شامل تھا۔[۴۶] انھیں کے ہم وطن سیف الدین کاکوروی نے اس فن میں مہارت حاصل کی اور بہت سے لوگ ان سے مستفید ہوئے۔[۴۷] شیخ حمزہ لکھنوی قرآن کریم کی تلاوت سے خصوصی شغف رکھنے اور حسن قراءت کے لیے معروف ہوئے۔[۴۸] عبدالقادر مندوی چشتی سلسلہ کے ایک صوفی تھے اور فن تجوید میں اپنی مہارت کے لیے بھی ممتاز ہوئے۔[۴۹] لیکن اکبر کے معاصرین میں اس فن میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کرنے والے شیخ مبارک ناگوری (م ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء) اور شیخ منور لاہوری (م ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء) ہیں۔ شیخ مبارک ناگوری کے بارے میں بصراحت یہ مذکور ہے کہ انھوں نے قراءت کے دس طریقوں کے مطابق قرآن حفظ کیا تھا اور اس علم سے متعلق امام شاطبی کی مشہور کتاب "حرز الامانی" (معروف بالشاطبیہ) زبانی یاد تھی۔ مزید یہ کہ وہ اس کتاب کا درس بھی دیتے تھے۔[۵۰] ان شواہد سے اس علم میں ان کی گہری دلچسپی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ شیخ منور لاہوری قراءات سبعہ کے ماہرین میں سے تھے۔ علم قراءت کے علاوہ فن تفسیر میں بھی انھیں امتیاز حاصل تھا۔ "درر التنظیم فی ترتیب الآی والسور الکریمہ" نامی ایک تفسیر کی تالیف بھی ان سے منسوب ہے جس میں نظم قرآن کے پہلو پر خاص زور دیا گیا ہے۔[۵۱]

عہد شاہجہانی (۱۶۲۷-۱۶۵۸ء) کے ممتاز علماء قراءت میں شیخ ابو المعانی (م ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء) شامل تھے۔ اس فن میں ان کی مہارت کی شہرت شاہی دربار تک پہنچی تو بادشاہ کی جانب سے دربار میں اس فن کے مظاہرہ کی فرمائش ہوئی، حسن اتفاق سے رمضان کا مہینہ تھا اور اسی کی مناسبت سے انھوں نے آیت شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰن..... کی قراءت پیش کی۔ ان کی قراءت سن کر بادشاہ پر رقت طاری ہو گئی اور اس سے اس قدر محظوظ ہوئے کہ دوبارہ قراءت کی فرمائش کی۔ بادشاہ نے آخر میں انھیں "شمس القراء" کے خطاب سے نوازا اور بگدام سے ملحق ایک قریہ بطور مدد معاش مرحمت فرما کر انھیں رخصت کیا۔[۵۲] علم قراءت میں شیخ ابو المعانی کی مہارت کے علاوہ اس واقعہ سے یہ ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے کہ سلاطین و ملوک کے دربار میں بھی خوش الحان قاریوں کی پذیرائی و قدر افزائی ہوتی تھی۔ یقیناً اس علم کی ترویج و اشاعت میں ممد و معاون ثابت ہوئی ہوگی۔ اورنگ زیب عالمگیر

(۱۶۵۸ـ۱۷۰۷ء) کے عہد میں علم قرارت کے ماہرین میں خصوصیت سے حافظ ابراہیم اور حافظ ضیاء اللہ بلگرامی (م ۱۶۹۷ء) قابلِ ذکر ہیں۔ اول الذکر عالم گیر کے استادوں میں سے تھے اور فنِ تجوید کے ساتھ ساتھ علم تفسیر و حدیث میں بھی ممتاز تھے۔ انھوں نے درس و تدریس کے ذریعہ ان علوم کی اشاعت کی خدمت انجام دی[۵۳]۔ حافظ ضیاء اللہ بلگرام کے سادات اور وہاں کے نامور علماء میں سے تھے۔ حافظ و قاری ہونے کے علاوہ عربی و فارسی زبان کے ماہر بھی تھے ان کا خاص شغلہ درس و افادہ تھا[۵۴]۔ ان کے لڑکے سید احمد بھی فن تجوید میں مہارت اور حسنِ قرارت کے لیے معروف تھے[۵۵]۔ بلگرام ہی کے ایک دوسرے عالم سید عبدالواحد (م ۱۷۴۸ء) بھی اس فن کے ماہر گذرے ہیں۔ یہ اٹھارویں صدی عیسوی کے ایک مشہور عالم سید طفیل محمد اترولوی کے شاگردوں میں سے تھے۔ علم قرارت سے ان کے خصوصی شغف پر اس امر سے واضح شہادت ملتی ہے کہ انھیں "شاطبیہ" زبانی یاد تھی[۵۶]۔

عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں علم قرارت و فن تجوید میں دلچسپی اور اس میدان میں معاصر علماء و قراء کی خدمات صرف اس علم کے سیکھنے سکھانے، اس کی درسیات میں انہماک اور بعض قدیم کتابوں کے ازبر کر لینے تک محدود نہ تھیں بلکہ اس فن کے ماہرین نے اسے تصنیف و تالیف کا موضوع بنا کر بھی اس کی نشر و اشاعت کی، لیکن اس ضمن میں یہ امر تعجب خیز ہے کہ اس عہد کے پہلے حصہ (عہد سلطنت) میں اس موضوع پر کسی تالیف کا ثبوت نہیں مل پاتا ہے۔ عہد مغلیہ کے ہندوستان میں اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۶۴۲ء) سے منسوب ہے۔ اس کا نام "الدر الفرید فی القراءۃ والتجوید" ہے۔ معاصر تاریخی کتب و تذکروں میں اس کا حوالہ نہیں ملتا لیکن بعد کے تذکرہ نگاروں نے اس کا بہ صراحت ذکر کیا ہے[۵۷]۔ اس عہد میں درسیات کی اہم و مقبول کتابوں کی شرح لکھنے کا عام رواج تھا۔ اس ضمن میں قرارت کی درسیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا جیسا کہ اس کے واضح ثبوت ملتے ہیں کہ مذکورہ کتاب کی تالیف سے قبل ہی اکبر کے عہد میں الشاطبیہ کی فارسی شرح لکھی گئی۔ اس کے لکھنے والے شیخ محمد صدیقی کاکوروی تھے[۵۸]۔ اسی شرح کے بارے میں الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند نے یہ ذکر کیا ہے کہ یہ تقریباً ستر جلدوں (زھاء سبعین جلدا) پر مشتمل ہے[۵۹]۔ لیکن انھوں نے اپنے اس

بیان کی تائید میں کسی معاصر یا غیر معاصر ماخذ کا حوالہ نہیں پیش کیا ہے۔ یہ بیان کچھ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ معاصر مورخ بدایونی نے اس شرح کے بارے میں بیان کیا ہے کہ یہ تقریباً ستر جز میں لکھی ہوئی تھی (شیخ محمد شرحی فارسی بر شاطبی نوشتہ قریب ہفتاد جزو)۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بدایونی کی منتخب التواریخ کے انگریز مترجم (مسٹر ڈبلیو، ہیگ) نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ یہ شرح تقریباً ستر دستہ کاغذ پر مشتمل تھی۔[۵۹ الف]

بادشاہ جہانگیر کے زمانۂ حکومت (۱۶۰۵ــ ۱۶۲۷ء) میں نور الدین محمد القاری نے "مقصود القاری" کے نام سے اس موضوع پر ایک کتاب مرتب کی اور اسے بادشاہ کے نام معنون کیا۔[۶۰] اس فن میں عہد شاہجہانی کی یادگار تالیف "خلاصۃ القراءۃ" ہے جو قاسم جونپوری سے منسوب ہے۔ یہ نو ابواب میں منقسم اور بادشاہِ وقت کے نام معنون بھی ہے۔[۶۱] دوسرے دینی علوم و فنون کے مثل علم قراءت کے میدان میں بھی تصنیفی و تالیفی خدمات کے اعتبار سے اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اس موضوع پر اس عہد میں متعدد کتابیں لکھی گئیں جن میں چار خصوصی ذکر کی مستحق ہیں۔ مفید القرار،[۶۲] حلیۃ القاری،[۶۳] نجاۃ القاری[۶۴] اور رسالہ علم تجوید۔[۶۵] ان کے مصنفین بالترتیب نعمۃ اللہ لاہوری (سن تکمیل ۱۶۷۳ء)، احمد بن رکن الدین الحسینی (سن تکمیل ۱۶۸۴ء) میر سید علی الحنظلانی اور ملا جیون (م ۱۷۱۸ء) ہیں۔ ان تمام میں "مفید القرار" خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ چودہ ابواب پر مشتمل ہے اور باب اول میں علم قراءت و قراءات سبعہ سے متعلق مفید معلومات پیش کی گئی ہیں۔ "نجاۃ القاری" اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہ اورنگ زیب کے نام معنون ہے۔ عہدِ عالمگیری ہی میں ایک شیعی عالم شیخ احمد بن رضا حیدر آبادی نے بھی اس موضوع پر "رسالہ فی القراۃ" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ لیکن ان کا سن وفات یا اس کتاب کا سن تکمیل معلوم نہیں ہو پایا ہے۔ صرف یہ ثبوت ملتا ہے کہ ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء میں وہ ہندوستان منتقل ہوئے۔[۶۶] مصنف کو حدیث و علم اسماء الرجال میں بھی خصوصی درک حاصل تھا اور اس موضوع سے متعلق بھی انکی کتابیں ملتی ہیں۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں "معرفۃ القراءۃ" کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی گئی۔ اس کے لکھنے والے عبدالرحیم بن یوسف تھے۔[۶۷] مصنف کے بارے میں مزید معلومات فراہم نہیں ہو پائی ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں علم قراءت و فن تجوید میں خاطر خواہ دلچسپی لی گئی اور اس فن میں مہارت رکھنے والوں کی اس وقت کمی نہ تھی بلکہ ایسے ایسے ماہرینِ فن موجود تھے جنہیں قراءت کے مختلف طریقوں (جو قراءات سبعہ یا عشرہ کے نام سے معروف ہیں) کے مطابق قرآن حفظ تھا۔ مزید یہ کہ کچھ ایسے شائقین و اہل ذوق بھی پائے جاتے تھے جنھوں نے اس فن پر امام شاطبی کی مشہور منظوم کتاب (مشتمل بر ۱۱۷۳ ابیات) اول تا آخر ازبر کر لیا تھا۔ اوپر کے مباحث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس علم کی نشر و اشاعت کے لیے معاصر علماء و فضلاء اور ماہرینِ قراءت نے مختلف ذرائع (درس و تدریس اور تصنیف و تالیف وغیرہ) اختیار کیے۔ اس کی ترویج میں انفرادی کوششوں کے علاوہ حکومت کی سرپرستی اور سلاطین و ملوک کی معارف پروری کا بھی حصہ رہا ہے۔ اس فن کی درسیات میں "الشاطبیہ" کو اس زمانہ میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ متعدد علماءِ وقت اس کتاب کی تشریح و توضیح کا خصوصی ملکہ رکھتے تھے اور ان میں سے بعض نے اس کے درس کو خصوصی مشغلے کے طور پر اختیار کر رکھا تھا جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی قراءت و تجوید کا موضوع عہدِ زیر بحث میں کچھ کم پسندیدہ نہیں رہا ہے۔ اوپر کے مباحث سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ معاصر ماہرین فن و اہل قلم نے اس سے متعلق متعدد تصنیفات و تالیفات پیش کیں اور بعض قدیم کتبِ قراءت کی شرحیں بھی مرتب کیں۔ الشاطبیہ کی مقبولیت کے پیشِ نظر شرح کے لیے بھی اسی ماخذ کو زیادہ ترجیح دی گئی۔

حواشی و مراجع

۱؎ جلال الدین السیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، مطبعہ حجازی، القاہرہ، ۱۳۶۸ھ، ۱/۱۰۲-۱۰۳، حاجی خلیفہ چلپی، کشف الظنون، استنبول، ۱۹۴۱ء، ۱/ ۳۵۳-۳۵۴، عدنان ازرزر، علوم القرآن، بیروت، ۱۹۸۴ء، ص ۱۸۲، راغب الطباخ، تاریخ افکار و علوم اسلامی (اردو ترجمہ: افتخار احمد بلخی)، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۳ء، ۱/ ۲۱۷-۲۲۴

۲؎ احمد بن حنبل، المسند (تحقیق احمد محمود شاکر) دار المعارف، مصر، ۱۹۴۹ء، ۱/ ۱۷۰، (باب اول)

روایت ہے[۳۲])

۳ے محمد عبدالحلیم چشتی، مقدمہ اردو ترجمہ الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی، اصح المطابع، کراچی، (بدون تاریخ)، ص[۱]

۴ے FUAT SEZGIN, GESCHICHTE DIS ARABISCHEN SCHRIFTTUMS, E.J. BRILL

LEIDEN, 1967, I/5

۵ے ابن الجزری، غایۃ النہایۃ فی طبقات القراء، ج۔ برجستراسہ، مکتبۃ الخانجی، مصر، ۱۳۵۱ھ، ۱/۴، عبدالحلیم چشتی، ص۷۰-۷۱

۶ے ابن الندیم، الفہرست، المطبعۃ الرحمانیہ، مصر، (بدون تاریخ) ص۲۵۳-۲۵۴، عبدالحلیم چشتی، ص۷۰-۷۱

۷ے عبدالحلیم چشتی، ص۷۰، الفہرست لابن الندیم، ص۵۲

۸ے عبدالحلیم چشتی نے جلال الدین سیوطی (بغیۃ الوعاۃ) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ انھوں نے ہارون بن موسیٰ کو قسرارت کے موضوع پر سب سے پہلا مصنف قرار دیا ہے اور یہ عبارت نقل کی ہے "وھو اول من تتبع وجوہ القراءات والفہا" (ص۷۱) لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ مذکورہ کتاب میں اصل عبارت یوں ہے "وھو اول من تتبع وجوہ القرآن والفہا" (مطبعۃ السعادہ، مصر، ۱۳۲۶ھ، ص۴۰۶)

۹ے عبدالحلیم چشتی، ص۷۱ (بحوالہ ابن الجزری کتاب النشر فی القراءات العشر)، الفہرست، ص۵۲ الاتقان، محولہ بالا، ۱/۷۵، کشف الظنون، ۲/۱۳۱۷

۱۰ے ابن الجزری، غایۃ النہایۃ، ۱/۲۵۵

۱۱ے غایۃ النہایہ ۲/۳۲۱، کشف الظنون، ۱/۳۵۴، خیرالدین الزرکلی، الاعلام، دارالعلم للملایین، بیروت، ۱۹۶۴ء، ۷/۳۲۳-۳۲۵، راغب الطباخ، محولہ بالا، ۱/۲۲۲، سید سلیمان ندوی، مقالات سلیمان، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء، ۳/۷

۱۲ے ابن الجزری، غایۃ النہایہ، ۲/۲۰، طاش کبری زادہ، مفتاح السعادہ ومصباح السیادہ، مطبعہ دائرۃ المعارف النظامیہ، حیدرآباد، ۱۳۲۸ھ، ۱/۳۸۷-۳۸۹، احمد بن محمد المقری، نفح الطیب، مطبعہ سعادہ، مصر، ۱۹۴۹ء، ۲/۲۲۹-۲۳۲، الاعلام، ۵/۱۸۰

۱۳ے محمد بن عبدالرحمن السخاوی، الضوء اللامع، مکتبۃ القدسی، القاہرہ، ۱۳۵۵ھ، ۹/ ۲۵۵-۲۶۰ طاش کبری زادہ، محولہ بالا، ۱/ ۳۹۲-۳۹۷، الاعلام، ۷/ ۴۵-۴۶۔

۱۴ے تفصیل کے لیے دیکھئے اشہد رفیق ندوی، مکی بن ابی طالب اور ان کی تفسیری خدمات، ششماہی علوم القرآن (علی گڑھ)، ۳/ ۱-۲ (جنوری-دسمبر ۱۹۸۸ء)، ص ۷۲-۸۰ اور محمد اجمل اصلاحی، مکی بن ابی طالب کی مطبوعہ تصانیف۔ کچھ نئی معلومات، ششماہی علوم القرآن، ۴/ ۲ (جولائی-دسمبر ۱۹۸۹ء) ص ۱۰۵-۱۰۸۔

۱۵ے ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۶۲ء، ص ۳۵۲-۳۵۳، ابن بطوطہ، رحلہ ابن بطوطہ، القاہرہ ۱۹۵۸ء، ۲/ ۱۵، شیخ نورالحق، زبدۃ التواریخ، روٹوگراف عدد ۱۸ (مخطوطہ برٹش میوزیم، ریسرچ لائبریری، شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ورق ۳ ب، شہاب الدین العمری، مسالک الابصار فی ممالک الامصار (انگریزی ترجمہ: اٹو اسپیس)، علی گڑھ، ۱۹۴۳ء، ص ۲۴-۲۵، ۳۹-۴۴

۱۶ے ملاحظہ ہوں راقم السطور کے مقالات: علم قرآن عہد سلطنت کے ہندوستان میں، عہد اکبری کی تفسیری خدمات، علم قرآن سترھویں صدی عیسوی کے ہندوستان میں، ششماہی علوم القرآن ۱/ ۲، ص ۱۱۸-۱۳۱، ۱/ ۳، ص ۱۱۲-۱۲۹، ۲/ ۱، ص ۷۲-۸۹ (بالترتیب)

۱۷ے برنی، ص ۳۵۵، میر حسن سجزی، فوائد الفواد (تصحیح محمد لطیف)، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۲۶۲، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، مطبع محمدی دہلی، ۱۲۸۳ھ، ص ۴۹، سید محمد کرمانی، سیر الاولیاء، موسسہ انتشارات اسلامی، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۲۸۵-۲۸۶

۱۸ے تاریخ فخر الدین مبارک شاہ (تحقیق و تصحیح ڈینی سن راس)، کلکتہ، ۱۹۲۷ء، ص ۲۱۔ تاریخ ہندوستان کے مصنف مولانا ذکاء اللہ نے سلطان قطب الدین ایبک کے تذکرہ میں لفظ "قرآن خواں" سے یہ مفہوم نکالا ہے کہ وہ حافظ ہو گیا (تاریخ ہندوستان شمس المطابع، دہلی، ۱۸۹۸ء، ۱/ ۲۷۲) لیکن قرآن خواں سے حافظ قرآن مراد لینا صحیح نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس کی تعبیر اچھی آواز سے قرآن پڑھنے والے سے کرنا زیادہ موزوں وقرین قیاس ہے جیسا کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا خیال ہے (سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۸۶)

۱۹ے یحیی سرہندی، تاریخ مبارک شاہی، کلکتہ، ۱۹۳۱ء، ص ۱۳۴-۱۳۵، برنی، ص ۵۲۷،

شمس سراج عفیف، تاریخ فیروزشاہی، کلکتہ، سنہ ۱۸۹۰ء، ص ۴۵۴ - ۴۵۵۔

۲۰ فہرست مخطوطات شیرانی، لاہور، سنہ ۱۹۶۹ء، ۲/ ۲۹۶، شیخ جلال الدین تھانیسری، رسالہ در بیع آراضی، مخطوط (مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) شیفتہ کلکشن، ۲۴/ ۲۶، ورق ۵ب

۲۱ فہرست مخطوطات فارسیہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (انگریزی) کلکتہ، سنہ ۱۹۲۴ء ص ۴۹۸-۹۹،
فہرست مخطوطات فارسیہ انڈیا آفس (انگریزی) مرتبہ ایتھ، آکسفورڈ، سنہ ۱۹۳۷ء، ۱/ ۱۶۱۰، ۲۹۷۱ء
نیز دیکھئے راقم کا انگریزی مقالہ "فتاوای فیروزشاہی عہد سلطنت کی سماجی و معاشی تاریخ کے ایک ماخذ کی حیثیت سے" اسلامک کلچر، ۶۰/ ۲ (اپریل-جون سنہ ۸۶ء) ص ۹۸-۱۰۰

۲۲ فوائد الفواد، ص ۳۲۳، مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ندوۃ المصنفین، دہلی، سنہ ۱۹۴۴ء، ۱/ ۱۷۹

۲۳ شہاب الدین العمری، محولہ بالا، ص ۳۹

۲۴ تاریخ فخر الدین مبارک شاہ، ص ۳۵

۲۵ برنی، تاریخ فیروزشاہی (تصحیح شیخ عبدالرشید) علی گڑھ، سنہ ۱۹۵۷ء، ص ۱۲۰ (باقی تمام حوالے کلکتہ ایڈیشن کے ہیں)

۲۶ سید عبدالحیٔ الحسنی، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، دمشق، سنہ ۱۹۵۸ء، ص ۱۱-۱۷، ابوالحسنات ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں، دار المصنفین، اعظم گڑھ، سنہ ۱۹۳۶ء، ص ۸۹-۱۰۰

G.M.D. SUFI, AL-MINHĀJ (BEING THE EVOLUTION OF CURRICULUM IN THE MUSLIM EDUCATIONAL INSTITUTIONS OF INDIA), IDARA ADBIYAT-I-DILLI, DELHI, 1977, PP. 1-88

۲۷ اس مدرسہ پر تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں KHALIQ AHMAD NIZAMI, STUDIES IN MEDIEVAL INDIAN HISTORY, (CH. VI - A MEDIEVAL INDIAN MADRASAH), ALLAHABAD, 1966, P.P. 73-79

۲۸ سیرت فیروزشاہی، نقل (مخطوط اورینٹل پبلک لائبریری، بانکی پور ۵۴۷)، مولانا آزاد لائبریری، یونیورسٹی کلکشن، نمبر ۱۱۱، ص ۱۳۷۔

۲۹ ڈاکٹر وحید مرزا، دیوان مطہر، اورینٹل کالج میگزین (لاہور) ۱۱/ ۳ (مئی سنہ ۱۹۳۵ء)، ص ۱۳۶-۱۳۷

۳۰ھ مولانا جمالی، سیر العارفین، مطبع رضوی، دہلی، ۱۳۱۱ھ، ص۱۰۳، پروفیسر خلیق احمد نظامی، ہندوستان میں علوم قرآنی کا نشوونما اور اسلامی معاشرہ پر اس کے اثر، معارف، ۱۴۴/۱ جولائی ۱۹۸۹ء، ص۵

۳۱ھ سرور الصدور (ملفوظات شیخ حمید الدین ناگوری)، مخطوطہ، ورق ۶۵ (بحوالہ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا مذکورہ مقالہ، معارف، ۱۴۳/۶، جون ۱۹۸۹ء، ص۴۲۰)

۳۲ھ فوائد الفواد، ص۲۶۱-۲۶۲

۳۳ھ پروفیسر خلیق احمد نظامی، مضمون محولہ بالا، معارف جون، ۱۹۸۹ء، ص۴۲۰

۳۳ھ الف۔ فوائد الفواد، ص۱۲۰، سیر الاولیاء، ص۲۴۶

۳۴ھ فوائد الفواد، ص۲۷۵-۲۷۶ سیر الاولیاء، ص۱۱۶، فقیر محمد جہلمی، حدائق الحنفیہ، لکھنؤ، ۱۹۰۶ء، ص۲۷۷-۲۷۸۔

۳۵ھ سیر الاولیاء، ص۱۱۷

۳۶ھ حوالہ مذکور، ص۳۲۶، مناظر احسن گیلانی، محولہ بالا، ۲/۱۶۰-۱۶۱

۳۷ھ سیر الاولیاء، ص۲۰۹

۳۸ھ فوائد الفواد، ص۳۲۳، اخبار الاخیار، ص۴۹۔

۳۹ھ برنی، ص۳۵۵

۴۰ھ سیر الاولیاء، ص۱۰۰-۱۰۲، محمد غوثی شطاری، گلزار ابرار، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، (مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)، حبیب گنج کلکشن، ۲۲/۵، اوراق ۴۶-۴۷، نزہۃ الخواطر، ۲/۵۹

۴۱ھ رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند، نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۱۰ء، ص۶۲، نزہۃ الخواطر، ۴/۱۱۱

۴۲ھ اخبار الاخیار، ص۲۱۲، نزہۃ الخواطر، ۴/۱۲۹

۴۳ھ نزہۃ الخواطر، ۴/۲۱۷

۴۴ھ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، کلکتہ، ۱۸۶۵ء، ۲/۲۱

۴۵ھ تذکرہ علمائے ہند، ص۱۶۶، نزہۃ الخواطر، ۴/۲۶۵-۲۶۶

۴۶ھ بدایونی، ۳/۲۴

۴۷ھ نزہۃ الخواطر، ۴/۱۳۱-۱۳۲

۴۸ه بدایونی، ۳/ ۶۳
۴۹ه نزھۃ الخواطر، ۴/ ۱۹۷
۵۰ه بدایونی، ۳/ ۴، تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲۴، غلام علی آزاد بلگرامی، ماثر الکرام، آگرہ ۱۹۱۰ء، ص ۱۹۷-۱۹۸،
۵۱ه گلزار ابرار، اوراق ۲۳۰-۲۳۲ نزہتہ الخواطر ۵/ ۴۱۱-۴۱۲، نیز دیکھئے راقم السطور کا محولہ بالا مقالہ، عہد اکبری کی تفسیری خدمات، ص ۱۲۲
۵۲ه ماثر الکرام، ص ۶۶-۶۷، مناظر احسن گیلانی (محولہ بالا، ۱/ ۳۶۲) نے مولانا آزاد بلگرامی کے حوالہ سے ان کا نام ابو المعالی لکھا ہے جبکہ مولانا آزاد نے بالصراحت قاری کا نام ابو المعانی اور ان کے والد کا نام ابو المعالی ذکر کیا ہے۔
۵۳ه بختاور خاں، مراۃ العالم، مخطوطہ، ورق ۳۰۱ (بحوالہ ڈاکٹر شبیر احمد قادری، عربی زبان و ادب عہد مغلیہ میں، نظامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص ۲۲۱)
۵۴ه ماثر الکرام، ص ۲۳۹-۲۴۰، تذکرہ علمائے ہند، ص ۹۸
۵۵ه ماثر الکرام، ص ۲۴۱۔
۵۶ه ماثر الکرام، ص ۲۸۹-۲۹۰، نزھۃ الخواطر، ۶/ ۱۲۳۔
۵۷ه الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند، محولہ بالا، ص ۱۴۳، نزھۃ الخواطر، ۵/ ۲۰۶
۵۸ه بدایونی، ۳/ ۲۴-۲۵، الثقافۃ الاسلامیہ (ص ۱۴۴) میں شیخ محمد کے لڑکے شیخ سعدی کا سن وفات (۱۰۰۲/ ۹۴-۱۵۹۳) غلطی سے ان سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ دیکھئے بدایونی، ۳/ ۲۵۔
۵۹ه الثقافۃ الاسلامیہ، ص ۱۴۴
۵۹ه الف۔ بدایونی ۳/ ۲۴-۲۵ و نیز انگریزی ترجمہ پٹنہ، ۱۹۷۳ء، ۳/ ۴۲
۶۰ه ڈی، این، مارشل، مغلس ان انڈیا (ببلوگرافیکل سروے)، بمبئی، ۱۹۶۷ء، ص ۳۸۲، نمبر ۱۴۲۶، فہرست مخطوطات فارسی کرزن کلکشن، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ص ۲۴۵، نمبر ۳۴۱ فہرست مخطوطات عربی، فارسی و اردو، آصفیہ لائبریری، حیدر آباد، ۱۹۱۰ء، ۱/ ۳۰۸، الثقافۃ الاسلامیہ، ص ۱۴۳

۶۱ھ مارشل، محولہ بالا، ص۲۹۶، نمبر ۱۴۸۰، فہرست مخطوطات فارسی کرزن کلکشن، محولہ بالا، ص۲۴۹، نمبر ۳۴۲

۶۲ھ مارشل، ص۲۷۶، نمبر ۱۴۰۷، فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس، محولہ بالا، ۱/۱۲۷۰، نمبر ۲۷۰۵، فہرست مخطوطات آصفیہ لائبریری، ۱/۳۰۸

۶۳ھ مارشل، ص۲۸۰، نمبر ۱۵۴۴، الثقافۃ الاسلامیہ، ص۱۷۴، فہرست آصفیہ لائبریری، ۱/۳۰۶، اسٹوری، پرشین لٹریچر، لندن ۱۹۲۷ء، ۱/۴۳۰، فہرست مخطوطات فارسی کرزن کلکشن، ص۲۴۹، نمبر ۳۴۳، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، ضمیمہ سبحان اللہ ۲۹۷؍۱۱۱/۵ ۔

۶۴ھ مارشل، ص۵۸، نمبر ۱۹۸، اسٹوری، ۱/۴۴

۶۵ھ اس رسالہ کا ذکر ڈاکٹر شبیر احمد قادر آبادی نے اپنی کتاب "عربی زبان و ادب عہد مغلیہ میں" محولہ بالا، ص۲۵۲) میں کیا ہے، کسی اور ماخذ یا کتاب سے اس کی توثیق نہیں ہو پائی ہے۔

۶۶ھ نزھۃ الخواطر، ۵/۳۹

۶۷ھ مارشل، ص۲۲، نمبر ۶۴، اسٹوری، ۱/۴۳، معرفۃ القراءۃ کا ایک مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری (مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) کے سبحان اللہ کلکشن (ضمیمہ سبحان اللہ ۲۹۷؍۱۱۱/۷) میں محفوظ ہے۔ علی گڑھ مخطوطہ کے برخلاف مارشل اور اسٹوری نے مصنف کا نام عبدالرحمن ذکر کیا ہے۔

آیات

(اسلامی معاشرہ میں سائنس کی بازیافت کا داعی)

سہ اشاعتی

سائنس کی تعمیر نو کا علمبردار بھی ہے اور
تاریخ فکر میں اقدار کی کارفرمائی کا نقیب بھی

انفرادی ۶۰ روپے (۳ شمارے سالانہ)
لائبریری و ادارہ ۱۰۰ روپے (" ")
فی کاپی ۲۵ روپے
تاجروں کیلئے خصوصی رعایت

مرکز الدراسات العلمیہ
CENTRE FOR STUDIES ON SCIENCE
AL HOMERA MUZAMMIL MANZIL COMPLEX
DODHPUR ROAD ALIGARH-202002